ہینڈ میڈ نظمیں

نعیم رشید

#HandMadeNazmain

زعیم رشید کی دیگر کتب

تروینی تیرے نام	تروینیاں
مشتعم	پنجابی شاعری
آیاتِ غزل	غزلیات
ریزگاری	نظمیں

A Lost Day and other Poem by Khalid Ahmad

In Quest of Love Poems By Zaeem Rasheed

www.zaeemrasheed.com

جب سورج چمکتا ہے..... چڑیاں چہچہاتی ہیں..... پھول مسکراتے ہیں..... موسم گنگناتے ہیں..... درختوں پر شگوفے پھوٹتے ہیں... ایسے میں نظمیں طلوع ہوتی ہیں..... میرا جنم ہوتا ہے..... نظمیں مجھے لکھتی ہیں یا میں انہیں لکھتا ہوں..... نظم کب میری محبوبہ بنی... معلوم نہیں..... میں کیسے نظموں میں ڈھلتا گیا، کچھ خبر نہیں.... نظمیں خود بتائیں گی..... یا ان نظموں کا قاری کوئی فیصلہ دے گا۔

ISBN REGISTRATION
978-969-2783-26-7
Rs. 500.00

NAZMINA PUBLICATIONS

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہینڈ میڈ نظمیں

زعیم رشید
www.zaeemrasheed.com

ہم اہلِ درد پکارے گئے مجنوں میں
ہم اہلِ عشق اُتارے گئے کتاب کے ساتھ

ہینڈ میڈ نظمیں

نظمینہ
0300-6996222

ISBN: 978-969-7635-16-0

نام کتاب	ہینڈ میڈ نظمیں
شاعر	زعیم رشید
ٹائیٹل	محسن رضا
اہتمام	فہیم رشید
مطبع	انور سنز پبلشرز
باراول	گرما 2022
باردوم	بہار 2023
قیمت	500 پاکستانی روپیہ
ناشر	نظمینہ

0300-6996222
www.zaeemrasheed.com

انتساب

نوید صادق کی مسافت کے نام

نس نس میں تھکن بن کے سمٹ آئی مسافت
دیکھا تھا فقط سایۂ دیوار کسی نے

خالد احمد

ڈاکٹر فرتاش سید

کی یاد میں

وہ تو وہ اس کی معیت میں گزارا ہوا پل
جو بھلائیں تو بھلانے میں زمانے لگ جائیں

دستک

اثاثہ	11
دعا	12
خدا اِک نظم ہی تو ہے	13
تخلیق	16
میں خود کو نظم کر لوں گا	17
یہ چادر کیوں نہیں ہٹتی	20
بلوغت کی ایک نظم	23
طرفین	25
تیسری دنیا	27
وہی ہوا ناں۔۔۔!	31
کولھو کا بیل	33
وراثت	35
زندگی مجھ پہ فلمائی گئی	37
A Visual Poetry	38
ملو گی۔۔۔؟	39
ہمیں بادل بلاتے ہیں	41
گھگھو گھوڑا	43
BLUFF	46

دھوپ اُس چہرے کی	47
کہانی سچ اُگلتی ہے	49
تروینی	52
کوہ قاف سے آئی ایک نظم	53
خواب	54
غینوی	55
تلاش	58
نفی اثبات	59
اُلجھن	63
اُداس دن کی ایک نظم	65
وادی کا گیت	67
بول ری مچھلی	69
مل مالک اور منشی جی	71
فنا فی العشق	75
ہمزاد سے ـ ـ ـ !!!	77
شاعر	80
چھنگلی	81
بیوی سے ـ ـ ـ !	82
Love in Busy Days	83
گنبد کی چڑیا	85

پہلی نظم اور دوسرا عشق	88
آئینہ	89
صدا پھرتی رہی تنہا	91
وارفتگی	93
موجود	94
دن گزرتا نہیں	95
کوئی سنتا نہیں	97
نامعلوم	99
حرا کی منزل پہ میں نے دیکھا!	104
کھڑکی کا چاند	105
دنیا بدل رہی ہے	106
انمول	107
60 برس کی نظم	110
ضرورت	111
آج بھی----	113
چور	114
جاگتے خواب	115
پیالہ بھر چکا ہے	117
عجب مرحلہ ہے!	119
گھروندا	121

ایک صدا کی دوری	123
دل کی گرہیں کھلی نہیں	125
آخری خواہش	127
کم سن افراد	128
سالگرہ کا دن	129
بدن سے مکالمہ	132
جاگتے خواب	133
ہمیں تاریخ لکھے گی!	135
+16	137
کتے	139
یہ طے ہو چکا ہے	141
اس پار	143
ایک ادھوری نظم	144
لوٹنا ہوگا	145
ہینڈ میڈ نظم	148
کوکھ	150
زینم کے لئے ایک نظم	151
میں جاؤں کہاں؟	153
یثرب والا!	154

اثاثہ

اسمِ احمد ہی اسمِ اعظم ہے

دعا

گندم کی بالیاں ہی وہ بیٹی کو دے سکے
مالک! مرے کسان کے کھیتوں کی خیر ہو

پیش لفظ

خدا اِک نظم ہی تو ہے

بس ایسا ہے

کہ مجھ میں صرف نرمل لفظ اُگتے ہیں

میں اپنی خود کلامی سے انھیں ترتیب دیتا ہوں

مرے وجدان میں الہام کی صورت کئی مصرعے اترتے ہیں

مرا ہونا نہ ہونا اِک برابر ہے

تو پھر کیوں راز مجھ میں منکشف ہوتے ہیں

میں اپنی جبلت میں نئی تخلیق کرتا ہوں

کہ اپنے ہاتھ سے نظموں کا بُنتا

اور خود کو کاٹ کر کاغذ پہ رکھ دینا کوئی آسان تھوڑی ہے

کسی کو کیا خبر اِس کی؟

اگر نظمیں نہیں کہتا تو سینہ پھٹ گیا ہوتا

میں کُھل کر ہنس نہیں سکتا

میں چُھپ کر رو نہیں سکتا

کبھی غمگین ہوتا ہوں

تو ساری گونگی نظمیں گیت گاتی ہیں

میں جس کی خامیوں کو خوبیاں تسلیم کرتا ہوں

وہ اِن نظموں میں رہتی ہے

یہ نظمیں تو کٹے ہونٹوں سے بانسریا بجانے کی

کوئی مجذوب خواہش ہے

فرشتوں کو کوئی زحمت نہیں دینا

کہ لکھیں اور لکھتے ہی چلے جائیں

مری نظمیں مرا اعمال نامہ ہیں

میں اِن کو حشر کے دن پیش کر دوں گا

۔۔۔۔خدا اِک نظم ہی تو ہے

کہ میں نے شاعری سے اپنے اندر ''خالی پن'' کو پُر کیا ہے۔۔۔۔

۔۔۔۔درد دُ گلا ہے

یہ میری شاعری میرا تعارف ہے

کہ جب سے زندگی اوڑھی تو مجھ پہ شاعری اُتری

ہوا کو قید کر لینے کی اِک معصوم خواہش میں

دیے کو بام پر رکھنے کو آیا ہوں

شبِ دیجور میں آنکھوں کے پانی سے نئے

اِک چاند کو تخلیق کرنے کی بس اِک موہوم کوشش ہے

جو پھولوں کی نہیں سنتا
جو اپنے درد اِن بوڑھے درختوں سے نہیں کہتا
وہ جس کو قہقہوں میں زندگی کے دکھ اُڑانے کا ہنر تک بھی نہیں آتا
وہ اِن نظموں کے باطن میں کہاں تک جھانک سکتا ہے
جو اپنی ذات کے جنگل میں خاموشی کی چیخیں سن کے اکثر بڑبڑاتا ہے
جو، سردی کوٹ کی جیبوں میں ڈالے

دھوپ اپنے سر پہ اوڑھے
پیاس کو پانی سے باندھے
خوشبوؤں کی اَن کہی باتوں کو سمجھے
رنگ اوڑھے اور ہوا کے سنگ ناچے گا
وہی اِن سُونی سُونی گم شدہ نظموں میں اُترے گا

یہ وحشت ہے۔۔۔۔
یہ اپنی اپنی وحشت سے کسی ہجرت کی جانب چل نکلنا ہے
یہ ہجرت ہے۔۔۔۔
یہ ہجرت ہے کہ جس میں
داخلی اور خارجی سب راستے مسدود ہوتے ہیں
یہ گہری نیند میں کانٹوں پہ چلنے کا ہنر ہے
آیئے،
اِک ساتھ چلتے ہیں!!

تخلیق

ہَوا کو جانے یہ کیا ہوا ہے؟
وہ آج کس سبز کپکپاہٹ میں مبتلا ہے!
وہ یوں درختوں میں چھپ رہی ہے
کہ جیسے تخلیق کے عمل سے گزر رہی ہو۔۔۔۔
ہَوا کی سانسیں اکھڑ کے پھر سے سنبھل رہی ہیں
ہَوا کا لہجہ بدل رہا ہے
وجودِ کیف و سرور اُس کا عجیب مستی کے ساتھ مجھ سے گزر رہا ہے
ہَوا پہ مصرعہ اتر رہا ہے!!!

میں خود کو نظم کرلوں گا

مِرا لفظوں سے وعدہ ہے

کہ جس دن اُس کو دیکھوں گا

میں خود کو نظم کرلوں گا

اِک ایسی نظم

جس میں ایک ہی کردار ہو گا

اور من و تُو کا

کوئی جھگڑا نہیں ہو گا

میں نیکی اور بدی کی پوٹلی میں

ساری دنیا کا خسارہ سامنے رکھ کر

تری رحمت کو دیکھوں گا

دُکھی عورت کے آنسو، مرد کی بے ہمتی

لفظوں میں ڈھالوں گا

غبارہ ڈھونڈتے بچے کی حسرت کس طرح لکھوں؟

ترے بارے میں

کوہِ طور پر جاتے ہوئے موسیٰ سے پوچھوں گا!

کنویں سے میں نکل آؤں گا

اور تہمت بھرا اِک ہاتھ

میری پشت سے کُرتے کو پھاڑے گا

مجھے۔۔۔۔

مچھلی اُگل دے گی

اُدھر میں راستہ بھٹکے مسافر کو

خضر کے ہاتھ میں دے کر چلا آیا ہوں مسجد میں

سنہری رات میں جو خواب بن کر شاعری اُتری تھی

میں اُس کی اذاں دوں گا

میں تپتی ریت پر کوڑے بھی کھاؤں گا

اور اس پر مسکراؤں گا

تجھے پڑھنا پڑے گا دکھ مِرا

سننا پڑیں گے سب گلے شکوے

مِرے محبوب کی جب اونٹنی گزری

تو میں بھی گھر کے دروازے میں بیٹھا

یاس و حسرت سے پکارا تھا

ترے بن کیا مِرا کوئی سہارا تھا !!

مِری امید کیوں ٹوٹی ۔۔۔۔؟

میں یہ سب اُس سے پوچھوں گا

مِرا لفظوں سے وعدہ ہے

میں خود کو نظم کر لوں گا

یہ چادر کیوں نہیں ہٹتی

نہ جانے کیوں بڑی ماں کو جنوں تھا حکمرانی کا
مِرے گھر کے سبھی کردار کہتے تھے
انھی کی حکمرانی ہے
انھی کی راجدھانی ہے
انھی کا یہ وتیرہ ہے
حویلی بھر کی جتنی چابیاں تھیں
اُن کے پلو سے بندھی رہتی تھیں
اور کس میں یہ جرأت تھی
کہ اُن کو چھو بھی سکتا ہو
یہ خوش بختی مگر میرا مقدر تھی
کہ وہ صندوق جب کھولیں
تو کمرے میں فقط مجھ کو بلاتی تھیں۔۔
تو میں یوں بے نیازی میں کچھ ایسے چل کے جاتا تھا

کہ جیسے کوئی شہزادہ

یہ سچ تھا۔۔۔سچ

کہ ابا جب کبھی ناراض ہوتے تھے

تو کہتے تھے کہ

امّاں دیکھ تیرے پیار نے اس کو بگاڑا ہے

یہ نالائق۔۔۔!

جسے کہتی ہو شہزادہ، شرارت کی پٹاری ہے

تو ایسے میں بڑی ماں ہنس کے کہتی تھیں

اَرے، جانے دے!

بچہ ہے!

یہی تو عمر ہوتی ہے، شرارت کی

وہ جب بھی پیسے گنتی تھیں

مجھے آواز دیتی تھیں

میں ان کے پاس بیٹھا بس

یونہی نظریں چرا کر

چپکے چپکے کچھ نہ کچھ پیسے اڑا لیتا
میں جب بھی پکڑا جاتا تھا
تو وہ ناراض ہو کر منہ کو چادر میں چھپا لیتیں
میں جب بھی توبہ کرتا تھا
مِرا منہ چوم لیتی تھیں
مگر اب کے
تو کوئی بھی خطا مجھ سے نہیں سرزد ہوئی
پھر بھی۔۔۔
سمجھ میں کچھ نہیں آتا
وہ کیوں ناراض ہیں مجھ سے!
انھوں نے کیوں چھپا رکھا ہے منہ
مٹی کی چادر سے
یہ چادر کیوں نہیں ہٹتی

بلوغت کی ایک نظم

کھل جا سم سم

کھل جا سم سم ۔۔۔

کھل جا سم سم کہنے سے بھی غارِ دہانہ کب کھلتا ہے!

میں نے اپنے تشنہ، تر سے گرم لبوں سے

نیند کے ماتے تن پر

ہلکے ہلکے دستک دی تو

کوئی نہیں تھا

کنڈلی مار کے بیٹھی دھوپ سے خود کو ڈسوانے کی لذت

اب شہوت میں بدل گئی تھی

جسم کی وحشت الماری میں اِک ہینگر سے لٹک رہی تھی

اس کھڑکی کی انگڑائی میں ایک خزانہ دہک رہا تھا

ایک برہنہ مست کنواری خواہش تھی جو

دومونہی اِک ناگن بن کر پھن پھیلائے جھوم رہی تھی

بیوہ رات کی ترسی آنکھیں کومل لہجہ چوم رہی تھیں

سورہ یوسف پڑھتے پڑھتے

میری سانسیں پھول گئی تھیں

گرچہ مجھ پر

غار دہانہ کھلا ہوا تھا۔۔۔۔

لیکن میں تھا

اپنی پیاس کو تنہا چھوڑ کے

بھاگ آیا تھا

طرفین

نگہ پرکار کی صورت کسی مرکز پہ رہتی ہے
کبھی ہم اجنبیت کھینچنے والی لکیروں کی مثلث ہیں
کہیں نقطے کے اُلجھاؤ میں جیون بیت جاتا ہے
محبت کا مربع ایک مسطر سے نہیں لگتا
تکونِ خواب کو بھی دائرے میں لانا پڑتا ہے
کبھی ٹوٹے ستارے قوس کو چھو کر زمیں پر آن گرتے ہیں
کبھی مخروطی خواہش جسم کے ہر زاویے میں رقص کرتی ہے
اندھیری رات کی جدول جوانی کے اُجالوں سے اُلجھتی ہے

کبھی ہم طاق راتوں میں دعائیں مانگتے ہیں جفت ہونے کی
کہیں دکھ کا گراف اپنی حدوں سے پار ہوتا ہے
ریاضی دان کو جیومیٹری کے طے شدہ کلیوں سے رخصت لینا پڑتی ہے
عمودی راستے خوشیوں سے کب ہموار ہوتے ہیں
عدد، گنتی اکائی کے اعادے وقت کی جھولی سے گرتے ہیں
محبت کا مربع ایک مسطر سے نہیں لگتا

تیسری دنیا

نہ جانے کتنے سالوں
کتنی صدیوں سے
یہاں کچھ بھی نہیں بدلا
ہماری زندگی کیا ہے
اذیت ہی اذیت ہے
خموشی چیختی ہے
اور خوشیاں بین کرتی ہیں
یہاں فن کو پذیرائی نہیں ملتی
ہماری کھیتیوں سے بارشیں ناراض ہیں
فصلوں پہ میٹھا پھل نہیں آتا
ہمارے ڈیم
-----خالی ہیں

مگر پھر بھی

ہمیں پانی بہائے جا رہا ہے
نوح کی کشتی

ہماری دسترس سے دور ہے

اب تک!

ہماری صبحِ صادق بھی کوئی شامِ غریباں ہے

یہاں سورج اُجالا ڈھونڈتا ہے

رات ڈرتی ہے اندھیرے سے

عجب اِک حسرتِ تعمیر ہے

دیوار و دَر سے جھانکتی ہے

مسکراتی ہے
ہم آنکھیں کھول کر دیکھیں

تو پھر بھی اَن کھلی سی ہیں

نظر کے سامنے منظر ہیں جو

رنگوں سے عاری ہیں

یہاں تو نت نیا اِک مسئلہ ہے
الجھنیں ہی الجھنیں ہیں

وقت کی بے ربط گردش ہے

خلش یہ ہے

کہ سیدھا چلتے رہنے سے کبھی منزل نہیں ملتی

یہاں دیوار در دیوار ہے

رستہ نہیں ملتا

یہاں رستہ بنانے کی تگ و دو کرنے والوں کو

سیاسی بھینٹ چڑھنا ہے

دیا امید کا کوئی جلاتا ہے

تو اس دھرتی کے کتے

کالے کتے

بھونکتے ہیں کاٹ کھانے کو

یہاں پاکیزگی اوڑھے فرشتے بھی اُتر آئیں

تو وہ مدِ مقابل سے اُلجھ جائیں

اگر ہم موت بھی چاہیں ---

تو وہ قسطوں میں ملتی ہے

ہماری سرحدوں پر گھن گرج بارود گولوں کی
سنہری چاندنی راتیں ہوں یا سورج کی حدت ہو
ہماری تیسری دنیا
کے موسم ایک جیسے ہیں
یہاں اعلیٰ دماغوں کی پنیری پھوٹتی ہے
جو ترقی یافتہ ملکوں میں جا کر
اپنے ہی ماضی کو یکسر بھول جاتی ہے
یہاں اعلیٰ دماغوں کی پنیری پھوٹتی ہے!
مگر یہ تیسری دنیا۔۔۔
کہ جس کو تیسرے نمبر پہ رکھنے کو
ترقی یافتہ اقوام نے پھندے لگائے ہیں
یہ پھندے خوش نما ہیں اور
ہماری اکثریت صرف LOLLIPOP پر خوش ہے
انھی میں ایک میں بھی ہوں
انھی میں ایک تم بھی ہو

وہی ہُوا ناں۔۔۔!

وہ کیفے ٹیریا کی میز پر بیٹھی ہوئی لڑکی
بِنا آواز کے جو کافی کی چسکی لگاتی تھی
تو میں اُس کی اداؤں میں اُلجھ جاتا
میں اپنی چائے میں بسکٹ ڈبوتا تو
عجب مشکل میں پڑ جاتا
وہ کہتی تھی
مری سوسائٹی میں MOVE کرنا تم کو آتا ہے
یہ تم دیہاتیوں کو کیا پتا اس کا
کچھ ایٹی کیٹس ہوتے ہیں
میں کہتا تھا

تمھارے ساتھ میرا وقت گزرے گا

تو سب کچھ سیکھ جاؤں گا

گزارا کرلیا جائے

اُسے بس ایک ہی دھن تھی

کنارا کرلیا جائے

کنارہ کرلیا اُس نے

سنا ہے

روز چائے میں

وہ اب بسکٹ ڈبوتی ہے

اور اُس پر خوب روتی ہے

کولھو کا بیل

بے آباد گھروں میں ایسا ہوتا ہے
دیس کی دوری سہنے والا
گھر کے ہر اِک فرد کی خواہش پوری کرتے کرتے
آخر۔۔۔۔
کولھو کا اِک بیل بنا ہے
ہر پہلی کو ہرکارے کے ہاتھ میں
ایک منی آرڈر کا رستہ تکتی
باپ کی آنکھیں خوشی خوشی تسبیح کے دانے
جلدی جلدی پھیر رہی ہیں
بھائی اپنے یاروں میں پردیس کے قصّے

رنگ برنگی آوازوں میں ہانک رہے ہیں

بہنیں ڈالر کے تعویذ بنا کر گلے میں ڈالے گھوم رہی ہیں

خوش فہمی کی ماری بیوی

اپنی جوانی عمر کے کیلنڈر میں رکھ کر بھول گئی ہے

ماں دیوار پہ بیٹھے کوّے کی آواز کو سن کر خوش ہوتی ہے

دیس کی دوری سہنے والا

اپنوں کی ہر فرمائش

خواب اور خواہش ڈھوتے ڈھوتے

رات کو تھک کر سو جاتا ہے

بے آباد گھروں میں یارو

اکثر۔۔۔۔

ایسا ہو جاتا ہے

وراثت

مجھے کچھ خواب ورثے میں ملے ہیں

کچھ ایسے خواب ہیں

جو جاگتی آنکھوں نے دیکھے

اور دیکھے آ رہی ہیں

جنہیں آنکھوں کے پانی سے مجھے نم رکھنا پڑتا ہے

دعا کرتا ہوں

مجھ کو خواب کی تعبیر مل جائے

میں ڈرتا ہوں

کہیں ایسا نہ ہو

یہ خواب۔۔۔بس یہ خواب رہ جائیں

وراثت منتقل کرنا پڑے گی اگلی نسلوں تک

تو وہ مجھ پر ہنسیں گے

انہیں کیسے بتاؤں گا

میں کچھ بھی کر نہیں سکتا

یہ ایسا خواب ہے

جس کو میں آنکھوں میں چھپا کر

مر نہیں سکتا

(یہ بابا کی آنکھوں سے چرائی ہوئی ایک حسرت ہے کہ وہ
ہجرت کا دکھ اٹھانے کے بعد اپنے وطن کو جیسا دیکھنا چاہتے
تھے مرتے دم تک ویسا نہیں دیکھ سکے)

زندگی مجھ پہ فلمائی گئی

ریہرسل ہو نہیں سکتی

عجب سکرپٹ ہے اس کا

ایڈیٹر ایک حیرانی میں کچھ بھی کٹ نہیں کرتا

کلوزاپ سین میں فیڈ آؤٹ ہو کر رہ گئیں خوشیاں

نہ جانے کیوں!

ہدایت کار کو پیک اَپ کی جلدی تھی

A Visual Poetry

ہنزہ سے کاغان کو جاتے
خیبر سے ملتان کو آتے
آوارہ منڈلاتے بادل
اِک تصویر بناتے ہیں
وہ تصویر
تمھاری ہے!!

ملوگی ۔۔؟

چمکتے تاروں کی روشنی سے زیادہ روشن بدن کی دیوی
تمھاری خاطر گلاب
ذہنوں میں کھل اٹھے ہیں
قدیم لوگوں کی داستانوں میں جھلملاتی حسین لڑکی
یہ بات سچ ہے کہ میٹھے پانی کے سارے چشمے
تمھارے ہونٹوں سے پھوٹتے ہیں
یہ آبشاروں سے نکلے جھرنے
تمھاری پازیب کی جھنک سے حسد کریں گے
سمندروں کی مچلتی لہریں تمہارے پیروں کو چومتی ہیں
اگر کبھی تم ہمالیہ کے سفر پہ نکلو۔۔۔
تمھاری نیلی چمکتی آنکھوں سے جھیل سیف الملوک چمکے
جو مسکراؤ تو دیوسائی کے سارے پھولوں میں رنگ اُتریں

یہ لگ رہا ہے کہ فیری میڈوز کی کہانی میں تم ملو گی

تمھارے جوبن کی اِک جھلک

سے گلیشئر بھی پگھل رہے ہیں

تمھاری خاطر شندور میلہ سجا ہُوا ہے

شگفتگی کے سجل جھروکوں میں چھپنے والی

ہَوا تمھاری گواہی دے گی

یہاں فراق اور ہجر کا مارا ایک شاعر

جو اپنے لفظوں کے جنگلوں سے تمہارا پیکر تراشتا ہے

اُسے یقیں ہے

کہ تم ملو گی ـ ـ ـ ـ

کہیں ملو گی ـ ـ ـ ـ

کبھی ملو گی ـ ـ ـ ـ!!!

ہمیں بادل بلاتے ہیں

نہ جانے کون سی دنیا میں رہتے ہو
ہزاروں فائلوں کا بوجھ ڈھوتی زندگی
اور دفتروں کی خاک
تم کو کچھ نہیں دے گی
یہ کاروبار کی چکی میں پستے لوگ کیا جانیں
تھکاوٹ عمر بھر کا بوجھ بن جائے تو روحوں کو نگل جائے
تم آخر کس لیے
پیسے بنانے کی لگن میں اپنی صحت کا بہت نقصان کرتے ہو
یقیں مانو خسارہ ہی خسارہ ہے
پہاڑوں کی قسم تم کو ـــــ
پہاڑوں پر چلے آؤ نظارہ ہی نظارہ ہے

یہاں کچھ آبشاریں برف کے کمبل کو اوڑھے سو رہی ہوں گی

تم اپنی سانس کی حدت سے

ان کے کاسنی جسموں پہ دستک دو

چلے آؤ۔۔۔۔۔

تم اپنی نیند کے جنگل سے آگے

جھیل جھرنوں تک چلے آؤ

یہاں آوارگی اوڑھے ہوئے ان بدمعاشوں کے

لبوں پر زندگی کے گیت لرزاں ہیں

یہاں اِک نظم کے آہنگ میں

روشن چراغوں کی لوؤں کی سرسراہٹ میں

حسیں منظر دکھاتے ہیں

ہمیں بادل بلاتے ہیں

گھگھو گھوڑا

کھلونے بیچتی

خانہ بدوش اِک خوبرو عورت

کی بغلوں میں پسینے سے

نظر پلٹی

تو آنکھوں میں

پرانے گھر کے دروازے پہ جا اٹکی

جہاں بچپن کسی بوسیدہ ویٹنگ لان میں بیٹھا مسافر تھا

فقط وہ کچھ روپے لے کر

مہینے بھر کی خوشیاں دے کے جاتی تھی

میں کہتا تھا۔۔۔

مجھے گھوڑا ہی بھاتا ہے

مجھے دے دو

وہ کہتی تھی۔۔۔

یہ گھگھو اور گھوڑا ہے

ازل سے اِن کا جوڑا ہے

یہ جوڑا ہی ملے گا اور اکیلا میں نہ بیچوں گی

بڑا گھگھو ہے تو، پگلے!!

خدا نے ان کے جوڑے آسمانوں پر بنائے ہیں

مِری بد قسمتی دیکھو

پرانی دشمنی کا بوجھ کاندھوں پر اٹھاتا ہوں

میں سب فرسودہ رسموں کو نبھاتا ہوں

میں اب اپنے قبیلے کے بزرگوں کا کھلونا ہوں

جنھیں معلوم ہے

جوڑے ۔۔۔

ہمیشہ آسمانوں سے اُدھر
تشکیل پاتے ہیں
مگر وہ خود خدا بن کر زمیں پر ہی بناتے ہیں
میں لندن سے پلٹ آیا ہوں
اپنی ڈگریاں لے کر
مگر میں اب بھی گھگھو ہوں ۔۔
میں گھوڑا ہوں
جو نیلے آسمانوں پر نہ بن
پایا وہ جوڑا ہوں

BLUFF

چوسر کے بکھرے پتوں میں اپنی عمر کے پتے ڈھونڈے

رنگ بھی کھیلا

اور جیون کے سب رنگوں میں

تیرے نام سے رنگ بھرے

سب یاروں سے شرط لگا کر

میں نے تاش کی بازی میں بھی تم کو جیتا

لیکن!

جیون، تاش کی اُلٹی پھینٹی سے بھی اُلٹا نکلا

یکّہ، گولا قابو میں تھے، ملکہ ہاتھ نہ آئی

دردنگر کے شاہ تمہاری عمروں کی رسوائی

دھوپ اُس چہرے کی

زندگی وقت کے پہیے کی طرح چلتی تھی
میں تھا ، دفتر تھا کبھی اور کبھی کاغذ تھے
وہ مِرے گرد کسی دائرے میں گھومتی تھی
وہ کوئی اور نہیں تھی وہ مری اپنی تھی
وہ محبت سے زیادہ ہی مجھے چاہتی تھی

وہ نہیں تو مِری سانسوں میں تسلسل بھی نہیں
اور اُلجھے ہوئے کاموں کا کوئی حل بھی نہیں
میری آنکھوں میں برستا ہوا ساون ہے مگر
دھوپ اس چہرے کی ہٹتی ہی نہیں آنگن سے
گھر کے کونوں میں پڑے درد چھپانے ہیں مجھے

اپنی تنہائی کو کچھ گیت سنانے ہیں مجھے
چھت پہ پھیلائے ہوئے کپڑے ابھی گیلے ہیں
دن بھی ڈھلنے کو ہے، بازار بھی جانا ہے مجھے
زندگی کرنے کو سامان بھی لانا ہے مجھے
اور اُس شوخ کو بھی دل سے بھلانا ہے مجھے

کہانی سچ اُگلتی ہے

مِرے بچپن کا قصہ ہے
مری اپنی کہانی ہے
کہانی سچ اگلتی ہے
کسی مٹیالی سی اِک خوبصورت شام کے
ڈھلتے ہوئے سائے کے آنگن میں
عجب سی اک حماقت پر
میں اپنے دوستوں، یاروں سے
یونہی بے سبب ناراض ہو کر گھر کو لوٹا تھا
تو ایسے میں مرے بابا نے مجھ کو گود میں لے کر کہا تھا
اَے مرے بیٹے!
یہ جیون ہے گلوں کی سیج مت سمجھو
یہ تنہا کٹ نہیں سکتا

غموں خوشیوں کے جھرمٹ میں

مرے بابا کے ہونٹوں پر ہمیشہ اِک تبسم رقص کرتا تھا

مگر یہ کیا!

کہ ان بارعب آنکھوں میں یہ آنسو کیوں اُمڈ آئے

وہ کہتے تھے، کہ

"ایک اور ایک گیارہ ہیں"

یہی دستورِ دنیا ہے

اکیلے کچھ نہیں ہوتا

میں چھوٹا تھا!

سو!

اُن کی بات سن کر دل ہی دل میں خوب ہنستا تھا

سمجھتا تھا،

انھیں تسبیح کے دانے گھمانے کے علاوہ کچھ نہیں آتا

وہ خود ہی تو کہا کرتے تھے:

''میں اسکول کے رسموں رواجوں سے نہیں واقف''
اگر اسکول جاتے تو
ریاضی کے سبھی قانون، کلیے قاعدے تک یاد کر لیتے
تو پھر ایسا نہیں کہتے

مگر یہ کیا!
کہ اب جو گھر کے آنگن میں اٹھی دیوار دیکھی ہے
تو جی گھبرانے لگتا ہے
وہ باتیں یاد آتی ہیں
میں اس دیوار کے سائے میں بیٹھا
سوچ میں گم ہوں
مرے بابا جو کہتے تھے
ہمیشہ سچ ہی کہتے تھے
کہ ایک اور ایک گیارہ ہیں

تروینی

غم ٹائی کی ناٹ میں باندھ کے گھر سے نکلا
خوشیوں کو وہ پرس میں رکھ کر آتی ہو گی

خواب کسی پرفیوم کی صورت اُڑ جاتے ہیں

کوہ قاف سے آئی ایک نظم

مجھ کو پریوں کے قصّے سناتی تھی وہ
ہر کہانی پرستاں سے لاتی تھی وہ
بوڑھے کمبل میں کھانسی چھپاتی تھی وہ

اور پھر ایک دن
اُس شفا خانے کے اجلے بستر پہ
میری کہانی کہیں کھو گئی
اب کے نانی کہانی سنائے گی کیا؟
چندا ماموں سے مل کر وہ آئے گی کیا؟
شام ہوتے ہی میں
اُن کے بستر پہ ہوں
میری آنکھیں
تجسس بھرے راستوں میں کہیں کھو گئیں

اور پھر۔۔۔
مجھ کو پریاں
کہانی سناتے ہوئے رو پڑیں

خواب

بلیک اینڈ وائٹ دیکھیں تو
انھیں رنگین کرنے میں
ہماری زندگی کے رنگ پھیکے پڑنے لگتے ہیں

نینوی

حد سے تجاوز کرتے تھے

جیسے بھی تھے

لوگ تو میرے اپنے تھے

دھیرے دھیرے سدھر ہی جاتے

لیکن میں نے جلدی کردی

اپنے ہی لوگوں سے میں ناراض ہوا

ایک حقارت لہجے میں تھی

بوریا بستر گول کیا

ویسے اس میں تھا بھی کیا۔۔۔

تسبیح ، مصلّی اور کتاب

مڑ کر بھی نہ دیکھا اپنے لوگوں کو

اور سمندر پار کی ٹھانی

موجوں کے انبوہ میں کوئی شورش تھی

میں جس کشتی میں تھا اس سے بوجھ اُتارنا لازم تھا
قرعۂ فال نکالا آخر
پھر سے گھمایا

۔۔۔۔پھر سے گھمایا

پہلی بار اور اب کی بار۔۔۔۔

اب کی بار بھی قرعہ میرے نام کا نکلا

پانی پہ ترچھی چوٹ پڑی تو

پانی کے بے تاب ہیولے

گھومتے گھومتے رستہ بھولے

آپس میں ٹکراتے

شور مچاتے

موج اُڑاتے مجھ تک آئے

لیکن چوبی تختے پر میں سنبھل نہ پایا

میری بے پتوار نگاہیں

خواب کا پشتہ چھونے میں ناکام ہوئیں

میں جب دریا بُرد ہوا تو

کالی رات کا ساکت پانی کیسے کیسے رنگ میں بدلا

گہرے بھیدوں والی آنکھیں غم کے بوجھ سے اُبل پڑیں

اور تالاب میں رینگنے والے

اس تہذیب کے سارے کچھوے تیرگی اوڑھے

کتنی صدیوں کا سناٹا لے کر من کی گہرائی تک آئے

گیلے گیلے پہناوے میں

ایک سنہری آہٹ آگے بڑھتی

ڈبکی بھرتی

تھپ تھپ چلتی مجھ تک آئی

تاریکی کے گھیرے میں

گڈ مڈ بیٹھا ایک بڑی سی۔۔۔۔

بہت بڑی سی توند میں ہوں

میں مچھلی کے پیٹ میں ہوں

تلاش

غم کی بارش میں بھیگتا موسم
جب بھی قوسِ قزح بناتا ہے
تیری صورت کو ڈھونڈنے کے لیے
میری آنکھوں میں ڈوب جاتا ہے

نفی اثبات

نہ میں نے خوشیوں کی بھیک مانگی

نہ دکھ سے میں نے نجات چاہی

نہ میں نے گوتم کی شکل اوڑھی

نہ اپنے نروان ہی کو پایا

نہ میں نے مسجد میں شب گزاری

نہ میں نے گرجا کی سیڑھیوں پر قدم جمائے

نہ میں نے راتوں کو مندروں میں دیئے جلائے

نہ اپنے ہاتھوں سے چھوٹے موٹے

خدا بنائے

نہ میں نے مذہب کی آڑ لے کر

زمین زادوں پہ ظلم ڈھائے

نہ میں نے مجذوب عورتوں کے بدن سراہے
نہ خواب دیکھے، نہ لمس چاہا
نہ لذتوں کی گھٹن میں اترا
کسی کے دربار کا مجاور بھی میں نہیں ہوں
نہ منتوں ہی کے دھاگے باندھے
جو میری قسمت کو کھول دیتے
نہ میں نے یاروں سے معجزوں ہی کا ذکر چھیڑا
نہ مجھ پہ کوئی صحیفہ اُترا
خدا کا بیٹا!
نہیں نہیں
میں خدا کا بیٹا نہیں ہوں ہرگز
نہ میرے ماتھے پہ تیسری آنکھ دکھ رہی ہے
نہ میرے لٹکے بدن سے
''حق ہو''
کا شور اُٹھا

بس ایک گردان چل رہی ہے
نہیں نہیں ہوں
میں ہوں
نہیں ہوں
میں ہوں، نہیں ہوں
میں ایک بہکی صدا میں بکھرا ٹھٹھر رہا تھا
طلسمی لفظوں نے مجھ کو باندھا
میں حرفِ کن ہوں
ازل سے لے کر۔۔۔
ابد کی جانب رواں دواں ہوں
میں حرف وصوت وصدا میں برپا
عجب طلسم گریز پا میں
خموش رستوں پہ چل رہا ہوں
میں ایک منزل
میں اِک دریچہ

میں ایک دھارا

میں اِک کنارہ

میں اِک سہارا ہوں

عشق ہوں میں

میں تیرا رستہ

میں روشنی ہوں

میں اِک زمانہ

میں ایک آہٹ

میں اِک صدا ہوں

میں آگ پانی

ہوا سے مٹی سے ماورا ہوں

اُلجھن

عجب اِک کشمکش نے ذہن و دل کو گھیر رکھا ہے

کبھی میں دل کی سنتا ہوں

کبھی دنیا کی سنتا ہوں

تمھارے نور سے میرے

زمین و آسماں روشن

تمھاری مسکراہٹ سے

مرے موسم بدلتے ہیں

سمجھتا ہوں

تمھاری نیلی آنکھوں کی خموشی کو

میں پڑھتا ہوں

تمھارے خطِ پیشانی پہ لکھی ساری تحریریں

کوئی ردِ بلا کا اسم بھی مجھ کو نہیں آتا

تمھارے صندلیں ہونٹوں کی خوشبو

میری وحشت کو بڑھاتی ہے

تمھیں جی بھر کے دیکھوں تو

مری سانسیں اکھڑتی ہیں

مرادو زخ بدن اب تک

تمھاری خوبرو باہوں کی جنت کو ترستا ہے

تمھیں تنہائی کے عالم میں اکثر گنگناتا ہوں۔۔۔

میں سب کچھ بھول جاتا ہوں

تمھاری سبز آنکھوں پر دعائے نور پڑھتا ہوں

اُجالوں سے مزین آسماں کے رتھ پہ بیٹھی نیلگوں لڑکی

تمھارا ہو بھی سکتا ہوں

مگر ہونے سے ڈرتا ہوں

میں تم کو چھو بھی سکتا ہوں

مگر چھونے سے ڈرتا ہوں

اُداس دن کی ایک نظم

تمہارے جانے کے بعد میں نے
اُداس دن میں جو آنکھ کھولی
تو لگ رہا ہے
زمین چلنے سے تھک گئی ہے
اُسے بھی لاٹھی پکڑنا ہوگی
ابھرتے سورج کی سانس اکھڑنے لگی ہے اور
چاند کی جبیں سلوٹوں سے پُر ہے

چمکتا سورج بھی بوڑھا بوڑھا سا لگ رہا ہے
چمکتے تاروں کے کالے بالوں میں چاندنی ہے
یہ کائنات اِک اجاڑ بستی میں ڈھل رہی ہے
عجب الم ہیں

عجیب غم ہیں

یہ بین کرتے ہوئے دھند لکے -----
نہ صبح چہکی

نہ شام مہکی

عجیب دن ہیں !!
گھڑی کی آواز میں جو لرزش ہے

عمر ڈھلنے کا عندیہ ہے

کسے بتاؤں؟

میں کیا بتاؤں؟

تمہارے جانے کے بعد

سچ ہے
گزرتی کب ہے ---- گزارتا ہوں

فقط CALENDAR اُتارتا ہوں

(19 مارچ 2013 حفیظ اللہ رحیم کی یاد میں)

وادی کا گیت

ہمیں اجازت
نہیں ہے ہرگز
کہ کھڑکیوں سے دھوئیں کے پردے ہٹا کے دیکھیں
ہوا سے لپٹیں
روایتوں کے، حکایتوں کے طلسم توڑیں
کواڑ حیرت سے تک رہے ہیں
مگر یہ ہمت نہیں کہ کھولیں
طلسم ہے کہ ہے خواب کوئی

یہ سچ ہے
ہم کو خبر نہیں ہے
اگر یہ چاہیں کہ چیخ لیں تو
ہماری آوازیں ساتھ دیں گی!
ہمیں تو یہ بھی خبر نہیں ہے
فضا پہ حاوی ہیں بے یقینی کے زرد بادل
جو منجمد ہیں

تو کس لیے ہیں؟
مگر یہ کیا ہے کہ
روشنی کا وظیفہ کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے، ہم کو
سوال کرنے کا اِذن کب ہے؟

کسے خبر ہے؟
ہم ان شبوں کے عتاب میں ہیں
کہ گمرہی کے عذاب میں ہیں
نحیف سانسوں کے چل چلاؤ میں
دل کی دھڑکن پکارتی ہے
کوئی تو ہوگا
مہیب رُت میں
جو خستہ آنگن کو روشنی کی نوید دے گا
برستی کرنوں کا نور دے گا
ہماری جنت سنوار دے گا
ہمیں بھی صبحِ بہار دے گا

بول ری مچھلی

''ہرا سمندر۔۔۔

گوپی چندر

بول ری مچھلی کتنا پانی۔۔

اتنا پانی''

اور یہ پانی بڑھتا جائے

جیسے جیسے عمر بڑھے

یہ روپ کا دریا چڑھتا جائے

راجہ کے وہ سپنے دیکھے

رانی وہ کہلائے

عرصہ بیتے کوئی بھی راجہ

بابل کو نہیں بھائے

سر میں روپ سنہرا چھلکے

اور ایسے میں سندر راجہ

ڈولی کیسے لائے

زخمی آنکھ سے ہرا سمندر

ٹک ٹک بہتا جائے

موت سے پہلے موت وہ چاہے

موت نہ اُس کو آئے

مل مالک اور منشی جی

اَرے منشی!

تمھیں معلوم ہے

سلوٹ زدہ چہرے مجھے اچھے نہیں لگتے

کئی شہروں، کئی ملکوں میں گھوما ہوں

مگر وہ حسنِ دوشیزہ۔۔۔

جو حوروں کو بھی شرما دے

کہیں سے ڈھونڈ کر لاؤ

اَرے منشی!

ہماری مل سے ملحق اُن گھروں میں جھانک کر دیکھو

''مِرے مالک یہ کچی بستیوں والے ہیں

جو کردار میں اپنے بہت ہی پختہ ہوتے ہیں''

او منشی عقل کے اندھے!

تم اتنا حبس کر دو ان پہ

کہ وہ سانس لینے کو قبائیں کھول دیں اپنی

یہ باہر

چیخنے چلانے کی آوازیں

کیسی ہیں؟

''میں۔۔۔۔

بختو۔۔۔۔۔

آپ کی اس مل میں

چوکیدار ہوں' صاحب!

بڑی بیٹی مری

امید سے ہے

اور دایہ مجھ سے کہتی ہے

کہ اس کو شہر لے جاؤ

اَرے

بختو! تمہارے کتنے بچے ہیں؟

''مِری دو بیٹیاں ہیں بس!

بڑھاپے کا سہارا تو خدا کے پاس جا پہنچا

بڑی بیٹی کی شادی۔۔۔۔۔

بتاؤں کیا۔۔۔۔۔

مِرے صاحب! "

"جھجکتے کس لیے ہو؟

جو بھی کہنا چاہتے ہو ۔۔۔"

مِری بیٹی کا شوہر۔۔۔۔

مِرے صاحب!

اپاہج ہے"

اور اپنی چھوٹی رانو تو

ابھی تک گھر میں بیٹھی ہے

اور اِن کی ماں!

خدا رحمت کرے اُس پر۔۔۔

اگر میں شہر لے جاتا تو شاید بچ ہی جاتی وہ

(اور اب کی بار صاحب جی کا لہجہ نرم ہوتا ہے)

"اَرے بختو۔۔۔۔

یہ پیسے لو

اور اُس کو شہر لے جاؤ“

”ارے او عقل کے اندھے!

مِرے منشی!

یاد رکھنا کچی بستی کے مکینوں پر

اگر احسان کر دیں تو

ہمیشہ یاد رکھتے ہیں

سُنو! کل شب۔۔۔

مِرے کچھ دوست آئیں گے۔۔۔۔۔۔“

”مگر

مالک! وہ بختو“

”ارے او عقل کے اندھے!

کہا ناں، دوست آئیں گے۔۔۔۔

تو بس۔۔۔۔

رانو کو لے آنا

فنا فی العشق

تمہارا نام آنے پر

نہ جانے کیوں؟

تمہاری دلنشین صورت

مِری آنکھوں کے پردوں پر ابھرتی ہے

شرابِ وصل کی لذت رگ و پے میں اُترتی ہے

مِرے ہونٹوں میں یخ بستہ حرارت رنگ بھرتی ہے

مجھے معلوم ہے!

تم سے ابھی میرا کوئی رشتہ

کوئی ناتا

کوئی بندھن نہیں، لیکن

تمہارا نام آ جائے

تو میں اپنے اکہرے تن بدن میں آج بھی وہ دن

وہ لمحہ زندہ تر محسوس کرتا ہوں
اگر کچھ یاد ہو تم کو؟
وہ خوابیدہ سنہری آرزو یک بارگی کس طرح جاگی تھی؟

تمہیں معلوم ہو شاید؟
مرے احساس میں کس لمس کے ادراک زندہ ہیں
ہماری سانس چلتی ہے، مگر
ہم خاک زندہ ہیں

ہمزاد سے ـــ !!!

دیکھو!

پَو پھٹنے والی ہے

کھڑکی میں سے جھانکنے والی صبح سے پہلے

اپنا سب کچھ لے جاؤ تم

لے جاؤ تم اپنی آنکھیں

اپنا جسم اور اپنے دکھ سکھ

اپنی ایک نشانی بھی مت چھوڑ کے جانا

دکھیا لمحوں کی بے انت مسافت

چھوڑ دو

اور بدن کے بکھرے حصّے

اور انا کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے

بستر کی ہر سلوٹ پر دم توڑتی یادیں

اُن کو چھوڑ دو

میری آنکھ میں زنگ آلودہ قفل پڑا ہے
دیکھو!
سامنے اَن دیکھے اِک خواب کی ٹوٹی کرچی
اس کو رکھ لو۔۔۔۔
جلدی کرلو

تم کو کل شب پھر آنا ہے
وقت سے پہلے آجانا

کاہے کو دشمنی کریں، سوچوں کو شل کریں
ہم کیوں نہ اپنے مسئلے ٹیبل پہ حل کریں

شاعر

وہ اَدھ کھلی سی گلاب صورت

حسین گُل کی مہین خوشبو

صبا کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے

گئے زمانوں کا عکس بن کر

جو میری آنکھوں میں دیکھتی ہے

۔۔۔ تو دیکھتی ہے

کہ تیرا شاعر

جو تیرے ہونٹوں سے رنگ لے کر

جو تیری آنکھوں کے رتجگوں سے خیال چُن کر

جو تیری زلفوں سے شاعری کا لباس بُن کر

جو تیرے چہرے کی مسکراہٹ کو

اپنے لفظوں میں ڈھالتا تھا

وہ جانے کب کا بکھر گیا ہے

تری محبت میں مر گیا ہے

تری محبت میں مر گیا ہے۔۔۔۔

چھنگلی

ایک انگشت فاضل مرے ساتھ ہے
میری مٹھی میں ہے پر مقید نہیں
وہ کسی بے وفا کی طرح ہے گریزاں مرے ہاتھ سے
فائدہ اس کے ہونے کا کچھ بھی نہیں
اُس کو رکھنے کا نقصان بھی تو نہیں
اُس کا ہونا نہ ہونا برابر سہی
یہ مرے جسم کا ایک حصہ تو ہے
اس کو یوں کاٹ دینا مناسب نہیں

اے زمانے!
ترے ساتھ لٹکی ہوئی ایک چھنگلی ہوں میں
میرا ہونا نہ ہونا ہے کس کام کا

بیوی سے ----

ہمیں زندگی کا سلیقہ نہیں ہے
مگر اپنے بچے بڑے ہو رہے ہیں

Love In Busy Days

ہمیں فرصت کہاں ہے؟

اس بدن کو بے بدن کر لیں۔۔۔

ہمیں فرصت کہاں ہے؟

زندگی کی نظم کو پڑھ لیں۔۔۔

ہمیں فرصت کہاں ہے؟

دھوپ کا کچھ ذائقہ چکھ لیں۔۔۔

ہمیں فرصت کہاں ہے؟

خواب اپنی آنکھ میں بھر لیں۔۔۔

تمھیں فرصت کہاں ہے؟

آنکھ میں جو خواب ہیں، پڑھ لو۔۔۔

تمھیں فرصت کہاں ہے؟

دھوپ کا تم ذائقہ چکھ لو ۔۔۔

تمھیں فرصت کہاں ہے؟

زندگی کی نظم کو پڑھ لو ۔۔۔

تمھیں فرصت کہاں ہے؟

بے بدن کو اِک بدن کر دو

سُنو!

یہ وقت، ظالم وقت

مہلت ہی نہیں دیتا

گنبد کی چڑیا

اِک پری وَش کہ حد سے زیادہ حسیں
اپنی نظروں کو نیچے جھکائے ہوئے
سرخ ہونٹوں میں آنچل دبائے ہوئے
سُرمئی آنکھ میں اِک چمکتا ہوا
عشق انگیز جذبہ چھپائے ہوئے
نرم و نازُک کلائی سے اتری ہوئی ایک چوڑی کو وہ توڑ کر
جب ہتھیلی پہ اپنے
مرے پیار کو ڈھونڈتی تھی
تو الجھن بھری گیلی پلکوں سے کیسے مجھے دیکھتی
ایسے لگتا تھا جیسے
کہ دنیا کو اب دیکھنا بھی نہیں چاہتی

میں اسے کہہ رہا تھا

کہ دیکھو اُدھر

سامنے!

کب سے چڑیوں کا جوڑا جو گنبد پہ بیٹھا ہوا ہے

وہ آپس میں چونچیں لڑاتا ہے

اور اس کو لوگوں کی پروا کہاں ہے

وہ بس پیار میں مست ہے

آؤ ہم بھی ----

مگر اُس نے ہنستے ہوئے

مجھ سے اتنا کہا!

تم کو وعدہ نبھانے کی عادت نہیں

تم تو حسب روایت

بہت دیر سے

آج پھر دیر سے آئے ہو

میں نے دیکھا ہے ان کو بہت غور سے

یہ جو معصوم چڑیا ہے اس کو خبر ہی کہاں

اس سے پہلے بھی اِک اور چڑیا یونہی

اپنی چونچیں لڑاتی ہوئی

پیار میں قسمیں وعدے نبھاتی ہوئی اڑ گئی تھی

یہ اب دوسری ہے

میں سب جانتی ہوں

کہ تم لوگ بھی -----

پہلی نظم اور دوسرا عشق

کئی وعدے کیے خود سے
بہت سی قسمیں کھائیں تھیں
محبت پھر نہیں کرنا
بڑا پختہ ارادہ تھا
مگر یہ عام سی لڑکی
یہ اب میری محبت ہے
وہ پہلے عشق کی باتیں
میں، سب اس سے چھپاتا ہوں
مگر نظموں میں اُس کے نام سے میں پکڑا جاتا ہوں

آئینہ

یہ بھی اِک طرفہ تماشا ہے یہاں

کلفتوں نے گھیر رکھا ہے ہمیں

جیب میں اِک پھوٹی کوڑی بھی نہیں

زندگی ناکام گزرے تو مصیبت یہ بھی ہے

زندگی کے نام سے ناآشنا افراد بھی

پند و نصیحت کے لیے آ جاتے ہیں

اپنی اپنی لَے میں جانے کیا مجھے سمجھاتے ہیں

جانتا ہوں،

خود نہیں معلوم ان کو!!

مشورہ کیا خاک دیں گے

اپنی اپنی ہانکتے ہیں

جس طرح سلطان پدرم بود ہوں
ایک چڑیا سے زیادہ بھوک کب ہے پیٹ کی
زندگی جینے کی خواہش تھی بہت
جو خواب میں تحلیل ہو کر رہ گئی
خود کلامی میں بھی اِک پند و نصیحت آ گئی
خود سے بھی آہستہ باتیں کیجیے
کروٹیں لیتی تمنا جاگ جائے گی زعیم!

صدا پھرتی رہی تنہا

بدن گولائیوں کے پھیر میں آیا

تو اس نے بالکونی میں سنورتی دھوپ کو دیکھا

کسی مجذوب عورت کی طرح رو کر دعا مانگی

کبھی درّوں میں گھومی

آبشاروں، کوہساروں میں صدائیں دیں

صدا چٹیل پہاڑوں،

جھاڑیوں اور جیل کے دیوار و در میں دور تک پھیلی

گھروں، برجوں میں گھومی

ایک ننھے خواب کی آنکھوں میں بھٹکی

سرخ کپڑوں میں چھپے مہندی لگے ہاتھوں کو دیکھا

آنکھ بھر آئی

کبھی اونچے مناروں پہ لگے گھڑیال کی ٹک ٹک سے ٹکرائی

کبھی وہ بند کمروں میں سمٹتی پھیلتی سرگوشیاں سن کر

کسی فاتح سپاہی کی طرح لوٹی

کبھی دَف، بانسری اور طبل کی آواز میں گونجی
کبھی وہ شام کے اخبار کی زینت بنی
راتوں سے الجھی
نغمہ بن کر صبحِ صادق کا ہوا کے دوش پر جھولی
کبھی خوشبو پہن کر غم کی بارش میں نہائی
اور فلک کو چھو کے لوٹ آئی
قسم زیتون کی
انجیر کی
اور طور سینا کی
کبھی مغرِب میں ڈوبی
اور مشرِق سے نکل آئی
صدا، دہقان کے کھیتوں میں بھٹکی مست پروائی
صدا، بلبل کے بچے کی طرح میرے
سرہانے سے اُڑی تو
پھر کبھی واپس نہیں آئی!

وارفتگی

گنگناتے بام و در پر نغمۂ سوزِ دروں
رات بھر کی جاگتی آنکھوں میں حیرت کی چمک
صبح کے بے باک لہجے سی خموشی کے حروف
بے شکن پوشاک پر مغرور خوشبو کی مہک
رات کے کمبل سے لپٹے چاند کی سرگوشیاں
جسم کی حدت کہ سورج جس سے کوسوں دور ہو
بے یقیں قدموں تلے روندے ہوئے رسم ورواج
اور یخ بوسوں میں کھلتے پھول کی آزردگی
تم نہیں سمجھو گے کچی عمر کی وارفتگی

موجود

رنگ بکھرے جوانی کے صندوق سے

قہقہے گر پڑے

سرکشی پہ جو مائل ہوا ہے یہ دل

قدغنیں توڑ دو

خواہشوں کو تم اپنی کھلا چھوڑ دو

آج کا دن دُوبارہ نہیں آئے گا

آج دیکھو مجھے

آج مل لو مجھے

شام ہو گی تو میرا بدن اُس میں ڈھل جائے گا

کل نہیں آئے گا

کل نہیں آئے گا

دن گزرتا نہیں

وہ اگن دیوتا
شام کی سرمئی گود میں بیٹھ جانے کو تھا
میں نے دیکھا تو بس دیکھتا رہ گیا
اس کی آنکھوں میں بھی مَست ہوتی ہوئی
شام کے رنگ بھرنے لگے
خواب اُترنے لگے

وہ اگن دیوتا مسکرایا
مجھے شام سا ایک مصرعہ سنایا
مجھے دھوپ نے جال بُن کے پھنسایا
ازل تا ابد دیکھتا ہوں مگر کوئی سنتا نہیں

دن گزرتا نہیں

اب میں مصروف دن کی عبادت میں ایسے گرفتار ہوں
جس میں دیمک سے ہاری ہوئی روشنی
میرے خوابوں پہ چابک سی کنڈلی میں بیٹھی ہوئی
اب میں نظموں کا تاوان دیتا ہوں
اور اپنے سوئے ہوئے خواب تکتا ہوں جو
شام کی گود میں سانس لینے کو تھے
مجھ کو سوئے ہوئے خواب بیدار کرنے پہ قدرت نہیں
میرے خوابوں کا موسم بدلتا نہیں
دن گزرتا نہیں

کوئی سنتا نہیں

میں سہاروں کا قائل نہیں

میں تو خود پیڑ تھا۔۔۔

میری شاخوں کے نیچے پنہ گاہ تھی

تیز آندھی چلی

کوئی طوفاں اٹھا

خوں طلب موسموں کی تباہی تھی یا۔۔۔

گرم لُو کی تمازت میں جھلسی ہوا

میں خنک سرد موسم سے تنہا لڑا

اور یہ تنہائی تھی

یا کہ دیمک تھی جو

تیز دانتوں، سیہ ناخنوں

زرد پنجوں سے مجھ کو نگلتی رہی

کھو کھلا کر گئی۔۔۔

اور میں چپ رہا

یہ مری بھول تھی

اور اسی بھول کی دھول میں منہ کے بل آ گرا

اور ایسا گرا

کہ کوئی سوکھی دھرتی کے سینے سے چمٹی ہوئی جڑ نہ تھی

جس کو آنکھوں کے پانی سے سیراب کر کے

بقا کی علامت کو تعبیرتا

میں کہ پند و نصیحت کا قائل نہیں تھا مگر

میری آواز پر

اب ٹھہرنا تو کیا

اپنی الجھی نگاہوں سے تکتے نہیں

شوخ ہنستے ہیں بس اِک برہنہ ہنسی

میری آواز کو

کوئی سنتا نہیں

کوئی سنتا نہیں۔۔۔

نامعلوم

وہ شاید پانچویں موسم کا کوئی آٹھواں دن تھا
کہ جب کیمپس کی ڈھلتی شام میں
میں نے اسے دیکھا
پریشاں زلف تھی، لیکن
عجب چہرے پہ اس کے تمکنت تھی
اور
نفاست تھی
بلا کی جاذبیّت تھی
وہ بے حد خوبصورت تھی
جو دیکھیں اس کو یوں لگتا تھا جیسے
ہر طرف شہنائی بجتی ہے
وہ ہنستی تھی تو لگتا تھا
کہ ہنسی کے سریلے گیت جیسے رقص کرتے ہوں

وہ آنکھیں گویا جادو کی کوئی ڈبیا

کوئی بھولے سے ان میں جھانک لےتو۔۔۔۔۔بس!

فسوں کی زد میں آجائے

کسی مجنوں کی صورت جنگلوں کی سمت چل نکلے

وہ اتنی خوبصورت تھی

کہ جیسے نور کی پہلی تجلی صورت آرا ہو

وہ چہرہ اتنا دل کش تھا

کہ جیسے صبح کا پنچھی کوئی نغمہ سناتا ہو

ملن کے گیت گاتا ہو

پیا کے ساتھ گزرے وقت کو آواز دیتا ہو

اُسے واپس بلاتا ہو

شفق آسا لبوں سے مسکراتی تو

رُخ قرطاس خود توسِ قزح کے رنگ میں ڈھل کر مجھے مخمور کر دیتا

دمکتا جسم گویا چاند کی کرنوں میں پوشیدہ خزانہ ہو

کہ جیسے زندہ رہنے کا وہ میرے اِک بہانہ ہو

غرور اس کی نگاہوں میں

کچھ ایسے رقص کرتا تھا

کہ جیسے من کے مندر کی کوئی پاکیزہ دیوی ہو

اور اُس کے پاؤں چھونے کو ہوائیں بھی ترستی ہوں

اور اُس کے اِک اشارے پر گھٹائیں بھی برستی ہوں

وہ سر کو جب جھکا لیتی

میں اس کو دیکھتا رہتا

وہ مجھ کو دیکھنے لگتی

تو میں نظریں چرا لیتا

اسے خود پر بہت ایقان تھا شاید!

وہ کہتی تھی

مجھے' تیری ضرورت کیا!

مصّور ہوں!

تری صورت بناؤں گی

پھر اُس میں روح بھر دوں گی

مجھے بھی زعم اپنی شاعری پہ تھا

میں کہتا تھا

تِری مسکان کو میں شاعری میں اس طرح بھر دوں گا

دنیا یاد رکھے گی

مجھے معلوم ہے یہ زندگی تیری بہت بے رنگ ہے لیکن
میں اس میں رنگ بھردوں گا
زمانہ تیری آنکھوں سے اُجالوں کا ذُرِنایاب مانگے گا
تری خاطر ہزاروں منتیں مانیں۔۔۔۔
مگر۔۔۔
بے سود۔۔۔
لاحاصل

کہ اِن لفظوں میں تیرا عکس آیا
تو نہیں آئی
تری سانسوں کی حدت، جسم کی خوشبو نہیں آئی
یہ سچ ہے
بدگماں میرے!
میں تیری یاد کے طوفاں میں ایسے لڑکھڑایا ہوں

کہ پاؤں جم نہیں پائے
مگر میں سوچتا ہوں کہ
اگر تو آج مل جائے

۔۔۔تو میں یہ صاف کہہ دوں گا

کہ میرے لفظ تیرے حسن کے شایاں نہیں ہیں اور

ترا پیکر،

تری صورت،

مِرے قرطاس سے آگے کی باتیں ہیں

مگر میں پھر بھی کہتا ہوں

جہاں ہو،

لوٹ آؤ، بس!

سنا ہے آج کل وہ

اِک پرائے CANVAS پر

بے صدا رنگوں کی بے ترتیب صورت ہے

کوئی بے جان مورت ہے

اُسے میری ضرورت ہے!

ابوبکر ہاسٹل ۔ جامعہ پنجاب

حرا کی منزل پہ میں نے دیکھا!

خدا کے دامن میں کوئی آیت نہیں بچی تھی

کھڑکی کا چاند

نم گرفتہ آنکھوں کو
اِک عجیب عادت ہے
نامراد، ساری رات
چاند تکتی رہتی ہیں
صبح کے اجالوں کو
روشنی کے ہالوں کو
کون روک سکتا ہے
دور کے مکانوں میں
چاند چھپ گیا، لیکن
دور کے مکانوں میں
کون جھانک سکتا ہے
چاند چھپ گیا لیکن
دل میں ایک خواہش ہے
چاند پھر نکل آئے
یا وہ سامنے گھر کی
بند کھڑکی کھل جائے

دنیا بدل رہی ہے

مستقبل کے خواب کا فرغل اوڑھے

صبح سویرے چوراہے پر

منی سکرٹ میں سترہ سالہ پھٹی پرانی غربت

اپنے چُور بدن کی لاش اٹھائے

پوری شب کا نصف معاوضہ لینے کی نادانی میں

کالے شیشے والی کار کی پچھلی سیٹ پہ بیٹھے

پینٹ اور کوٹ سے اُلجھ پڑی تھی

شاید اس کے دل میں

بوٹوں کی جھنکار کا کوئی خوف نہیں تھا

دنیا بدل رہی ہے!!!

انمول

یہ لکڑی ہے

یہ بالکل عام سی لکڑی کا ٹکڑا ہے

جسے دو چار سکوں سے زیادہ میں کوئی کیونکر خریدے گا؟

مگر جب کاری گر اِس کو تراشے گا

کرکٹ کا یہ اِک خوش رنگ، دل آویز سا بلّا بنے گا۔۔۔۔

اور کاری گر

کسی دکان پر

اِس کو نہایت کم روپوں میں بیچ ڈالے گا

یہی کارِ معیشت ہے

یہی رنگِ تماشا ہے

کھلاڑی آئے گا

دکان سے بلا خرید ے گا

کرکٹ عالمی میلے میں وہ اِک میچ کے دوران میں

اِک آخری اُوور کی بالکل آخری اِک بال پر چھکا لگا کر

میچ کا پانسہ پلٹ دے گا۔۔۔

اور اُس بلے کو چومے گا

اُسی کا نام گونجے گا۔۔۔۔۔۔۔۔

کسی ہیرو کی صورت۔۔۔۔۔۔۔۔

وہ سراہا جائے گا ہر سُو

ہزاروں تالیوں کے شور میں

داد و دہش کے پھول برسیں گے

یہ بلّا۔۔!

اب کوئی لکڑی کا معمولی سا اِک ٹکڑا نہیں ہے

اب ہزاروں ڈالروں میں اِس کی قیمت ہے

ہزاروں ہاتھ اس کے لمس کی خاطر مچلتے ہیں

سنو!

یہ عام سے الفاظ ہوتے ہیں

جنھیں ہم روز سنتے ہیں

جنھیں ہم روز کہتے ہیں

مگر تخلیق کی کچھ کم ریا لیکن بہت روشن

سعادت مند گھڑیوں میں

قلم کے خوبرو سانچے میں ڈھل کر

جب کسی شاعر کے ہونٹوں سے ادا ہوتے ہیں

تو سچائیوں کا بول ہوتے ہیں

بہت انمول ہوتے ہیں

یہی رنگِ معیشت ہے

یہی کارِ تماشا ہے!

60 برس کی نظم

بے صدا آہٹیں
رُخ پہ ویرانیاں
پھیکی پھیکی ہنسی
اور اُداسی عیاں
آ گئے ۔۔۔ آ گئے ۔۔
خود پہ ہنسنے کے دن
آ گئے !!!

ضرورت

اِدھر رات کی پوٹلی کھل گئی ہے

اُدھر LAS VEGAS کے

سب CASINO کھلے ہیں

میوزک زبانوں سے آگے کی شے ہے

کسی ترجمے کی ضرورت نہیں ہے

میں اس کی زباں تو نہیں جانتا تھا' مگر

آنکھ اس پر ہی جا کر ٹھہرتی

مجھے اس بدن میں کوئی اشتہا تک نہیں تھی

میں شاعر تھا

مجھ کو زبانوں کی چاہت نے گھیرا ہوا تھا

یہاں ڈانس کرتے

تھرکتے۔۔۔۔بھڑکتے ہوئے

سارے جسموں کی اپنی زباں تھی

وہ بچھڑے کسی پل کی ساری تھکن

اپنی بوتل میں ڈالے
حلق میں انڈیلے چلے جا رہی تھی
مگر تشنگی تھی کہ جسموں کے ہنگام میں رچ گئی تھی

جوانی کی نشے میں ڈوبی حسینہ سے آنکھیں ملیں
اور جھپکنے سے عاجز ہوئیں
اِدھر اور اُدھر ایک جیسی فضا تھی
محبت کی کلیاں چٹخنے لگی تھیں
کئی بوتلیں اس کے پاؤں میں پڑ کر چھلکنے لگی تھیں
وہ پلٹی تو اِک اضطراب اس کی آنکھوں میں تھا اور
اِدھر۔۔۔
میرے چہرے پہ رنگوں کی برکھا کھلی تھی
اُس کی زباں تو نہیں جانتا تھا
وہ میری زباں پر زباں رکھتے ہی
مطمئن ہو گئی تھی

محبت زبانوں کی محتاج کب ہے
دہکتے ہوئے جسم کب بولتے ہیں
کسی ترجمے کی ضرورت نہیں ہے

آج بھی-----

آج بھی میں نے چاند کو دیکھا
آج بھی اِک سگرٹ سلگایا
آج بھی میں نے نظم کہی ہے

آج بھی تجھ کو یاد کیا ہے
آج کا دن بھی کاٹ لیا ہے

چور

مہینے کے مہینے
گھر میں خوشیاں
بھیجنے والے کے دکھ
چہرے پہ لکھے ہیں

بڑی مدت کے بعد
اپنے وطن آیا ہے
اور بیوی سے وہ
آنکھیں چراتا ہے

فقط پردیس سے وہ
درہم و دینار لایا ہے
جوانی چھوڑ آیا ہے

جاگتے خواب

پولی تھین میں نان، چپاتی
ٹین کے ڈبہ میں سالن
حفظانِ صحت کا لیبل
اور پانی کی بوتل
جھلمل کوٹھی، ٹھنڈے کمرے، تپتے بستر
ہائی پر ٹینشن۔۔۔
گولی۔۔۔
کچی نیند میں کچا آنگن
اُپلوں کے جاں سوز دھوئیں میں
آنکھیں ملتی بوڑھی مائیں

صبح سویرے چاٹی کی ٹھنڈی لسی
دیسی گھی میں گندھی ہوئی رات کی روٹی
ذہن کی تہہ سے اٹھنے والی
مرچ اچار کی خوشبو
خالص پیار کی خوشبو

جگراتوں سے بچ رہنے کی خواہش بھی
کیا کیا خواب جگا دیتی ہے
ماضی سے ملوا دیتی ہے

پیالہ بھر چکا ہے

دمِ رخصت ہے

کتنے کام باقی ہیں

جو کرنا تھے

اگرچہ جانتا تھا سب خسارہ ہے

مگر پھر بھی

گلابوں کو ابھی گلدان میں رکھنے کی فرصت مل نہیں پائی!

کہانی کھل نہیں پائی

محبت بھی ادھوری ہے

محبت کی کہانی کو میں اب کتنا سمیٹوں گا

غزل جو تم پہ کہنا تھی

ابھی وہ ذہن کے پردوں پہ لرزاں ہے

تمہارے لمس کا احساس!
مگر اب کب یہ ممکن ہے کہ کاغذ پر اُتاروں میں
مِری پوروں کی جانب تک رہی ہے
اسمِ اعظم کی سنہری روشنی جس نے
تہجد کی دعاؤں میں ہمارا ساتھ دینا تھا
تمھاری یاد چمکے تو درودِ تاج پڑھتا تھا

مگر اب ہجر خوابوں کی بصارت لے گیا ہے
کہانی اختتامی موڑ پر ہے اور
پیالہ بھر چکا ہے
ہاں!
مری آنکھوں کے پانی سے پیالہ بھر چکا ہے

عجب مرحلہ ہے!

بدن کی تمازت سے میں بے خبر تھا
مگر ایک دن جب کنکھیوں سے میں نے
ابھرتی ہوئی دھوپ چھپ چھپ کے دیکھی
تو شہوت نے مجھ پر کئی راز کھولے
خبر ہی کہاں تھی۔۔۔!
یہ شہوت بھرے سرد بو سے
پھسلتے پھسلتے مری روح تک جا رکیں گے

سن، اے میرے سینے سے لپٹی ہوا!
تجھ پہ کافور اترا ہوا ہے

نظر بھر کے دیکھو!

مجھے میری تکمیل سے کون رو کے کھڑا ہے

تعفن بھرے جسم کے معجزوں کی غلاظت

مجھے اور بہکا رہی ہے

مجھے میرے رستے سے بھٹکا رہی ہے

اِدھر میری نظموں کی ویرانیاں

میرے دل کو مسلسل جھنجھوڑے چلے جا رہی ہیں

عجب مرحلہ ہے!

کہ میں اپنے خوابوں پہ

یلغار کرنے کو مائل کھڑا ہوں

گھروندا

بے یقینی کی چادر کو اوڑھے ہوئے

میں اُداسی کے پاؤں لپٹتا رہا

دھوپ مجھ کو گلے سے لگائے رہی

راہ چلتے ہوئے

سیپیاں چنتے بچوں نے دیکھا مجھے

میں کہ بکھرا ہوا تھا اکٹھا کیا

پاؤں رکھ کے بنایا سنوارا مجھے

میں گھروندا بنا

ننھے بچوں کی اٹکھیلیوں سے مرا دل بہلتا رہا

شام ڈھلنے لگی تو

شرارت سے بچوں نے توڑا مجھے
پھر اُداسی کی بانہوں میں چھوڑا مجھے
رات بھر مجھ سے پانی نے سرگوشی کی

آج شب ہوں یہاں
کل کہیں اور ہوں
میں تو ساحل پہ بکھری ہوئی ریت ہوں

ایک صدا کی دوری

جب یاد کسی کی آئے تو
کوئی چلمن سی لہرائے تو
جب دل کی دھڑکن ساتھ نہ دے
جب ہاتھ میں کوئی ہاتھ نہ دے
جب ہاتھ میں کنگن چھنکے تو
جب ضبط کا بندھن ٹوٹے تو
تم تنہا بیٹھ کے رو لینا
شبنم سے پلکیں دھو لینا
جب ملنے کے دن آ جائیں
جب خوشیاں من کو بھا جائیں
یہ سوچنا کہ ہم بچھڑے کیوں
اور خواب ہمارے بکھرے کیوں

کچھ پھولوں کو تم چن لینا
خوشیوں سے دامن بھر لینا
کچھ میری وفائیں یاد رہیں
کچھ، میری دعائیں یاد رہیں
کچھ حرفِ دعا بھی یاد رہیں
ہر حرف میں سو سو رمزیں ہیں
ہر رمز میں ہیں امکان بہت
بس ایک صدا کی دوری ہے

دل کی گرہیں کھلی نہیں

تری جستجو ، تری چاہ میں
میں نکل پڑا تری راہ میں
مجھے راستوں کی خبر نہیں
مِرے پاس رختِ سفر نہیں
مِری منزلیں ، مِرا فاصلہ
مِری جستجو سے وَرا نہیں
میں رکا نہیں، میں جھکا نہیں
کہیں راستوں میں بٹا نہیں
میں امینِ کربِ وصال ہوں
مِرا حوصلہ بھی چٹان ہے
میں تھکا نہیں، میں گرا نہیں
ابھی بال و پر میں اُڑان ہے
مجھے عشق ہے کسی ایک سے
جسے ڈھونڈنا مِرا مان ہے
مجھے کیا خبر کہ ریاضتیں

ہیں یہ وحشتیں کہ قیامتیں
مِرا حال کتنا عجیب ہے
مِرے خون میں جو دھمال ہے
ترے ہجر ہی کا کمال ہے
مجھے موت کی تو خبر نہیں
مرا زندہ رہنا محال ہے
ترے ہجر کی یہ تمازتیں
مِرے روز و شب کی انیس ہیں
ترا قرب ہے مِری زندگی
یہ طریقِ وصل ہو دائمی
یہ جو حرف میری دُعا میں ہیں
کئی آبلے مِرے پا میں ہیں
مرے دوستوں کو خبر نہیں
یہ جو راستوں کے ہیں پیچ و خم
مِرے دل کی گرہیں کھلی نہیں
مجھے خود خبر نہیں ہو رہی
میں ادا میں ہوں یا قضا میں ہوں

آخری خواہش

کبھی خدا میری بات سن لے

تو میں کہوں گا۔۔۔!

ذرا سی پنشن پہ پلنے والے

غریب تنخواہ دار بیٹے کے بوڑھے بابا کو موت آئے

تو وہ مہینے کے پہلے دن ہوں

کم سن افراد

کھیل ہے کس کا؟
کس کی بازی؟
کون کھلاڑی؟
کس نے جیتی؟
کس نے ہاری؟
کس کو خبر ہے!

بکھری تاش کے باون پتے
اِک دوجے پر خود ہی حاوی
یہ ڈھوروں کے جتھے

سالگرہ کا دن

سالگرہ کا دن ہے

اور میں

درد کی شمعیں روشن کر کے بیٹھ گیا ہوں

تنہائی کا کیک سجا کر

یادوں کے کمرے میں بند پڑا ہوں

تشنہ جسم پہ رکھی ہوئی گمنام حرارت

جلتے ---

بجھتے ---

HAPPY BIRTH DAY

کہتی ہے

دوری اور مجبوری کا میسج آنے میں

وقت پڑا ہے

بند کواڑوں سے ٹکراتی سرد ہوا

چاروں جانب بھاگ رہی ہے

اس کو بھی دیوار سے لگ کر

رونے والی خاموشی کی چیخوں سے ڈر لگتا ہے

میں وحشت میں اُلجھا

اپنی سانسوں کو جھنجھوڑ رہا ہوں

ٹائم پیس کی ٹک ٹک کرتی سوئی

گویا پھن پھیلائے ناگ کی صورت دل کو ڈستی جاتی ہے

پچھلے سال کے کیلنڈر میں

کتنی یادیں ناچ رہی ہیں

اس کمرے میں ہم دونوں تھے!

اپنے ہاتھ سے اِک دوجے کو

کیک کھلاتے

ہنستے، گاتے

اور خوابوں کے پر لہراتے!

لیکن اتنی یادوں میں سے

کس کس کو دہراؤں گا

اپنا دل بہلاؤں گا

کیک پہ چلتی لو کی صورت

روتے روتے بجھ جاؤں گا۔۔۔

بدن سے مکالمہ

نیند کے تسلسل میں
ہڑبڑا کے اُٹھ جانا
اِک عجیب وحشت ہے

پاس لیٹی بیوی بھی
ڈر کے مجھ سے کہتی ہے
کیا ہوا ہے، بولیں ناں !
کوئی خواب دیکھا ہے؟
اس کو کیا بتاؤں میں
آسماں سے اِک دیوی
خواب میں اُترتی ہے
اپنا حق جتاتی ہے

جاگتے خواب

پولی تھین میں نان، چپاتی
ٹین کے ڈبہ میں سالن
حفظان صحت کا لیبل
اور پانی کی بوتل
جھلمل کوٹھی، ٹھنڈے کمرے، تپتے بستر
ہائی پرٹینشن۔۔۔
گولی۔۔۔
کچی نیند میں کچا آنگن
اُپلوں کے جاں سوز دھوئیں میں
آنکھیں ملتی بوڑھی مائیں
صبح سویرے چاٹی کی وہ ٹھنڈی لسی
دیسی گھی میں گندھی ہوئی وہ رات کی روٹی

ذہن کی تہہ سے اٹھنے والی
مرچ اچار کی خوشبو
خالص پیار کی خوشبو

جگراتوں سے بچ رہنے کی یہ خواہش بھی
کیا کیا خواب جگا دیتی ہے
ماضی سے ملوا دیتی ہے

ہمیں تاریخ لکھے گی!

یہ ہم جو کاروانِ ذات سے باہر نکل کر دیکھتے ہیں
اور جب دیوار کو ہم توڑ دیتی ہے
ہمیں تاریخ لکھتی ہے
مری تلوار
زنگ آلود ماضی میں کسی معدوم ہوتی قبر میں
ہے دفن کب سے
مِرے بازو بھی شانوں سے جدا ہیں
ہاں! مرے بازو بھی شانوں سے جدا ہیں
اور زبانوں پر لگے تالے

ہم اپنی بات کہنے سے گریزاں ہیں
اپاہج قوم کی ہر بات کو تاریخ لکھے گی
اپاہج قوم کی ہر بات کو تاریخ لکھے گی!
ہمیں تاریخ لکھے گی
کہ آئندہ کی نسلیں پڑھ سکیں ہم کو
نئے معنوں میں زندہ کر سکیں ہم کو

16+

---کالج میں آتے ہی '

یوں لگ رہا ہے کہ جیسے

مرے جسم پہ کوئی پر لگ گئے ہیں

میں بالی عمریا میں ہی

عشقیہ داستانیں بھی پڑھنے لگا ہوں

موبائل کے میسج '

میں کیوں دوستوں سے چھپانے لگا ہوں

گزرتی ہوئی خوبرو لڑکیوں کو

میں چھپ چھپ کے

کیوں دیکھنا چاہتا ہوں

جوانی کی سیڑھی پہ چڑھنے سے پہلے ہی

نیندیں سرکتی چلی جا رہی ہیں

میں اٹھارہ سے پہلے '

کمرے میں چھپ کر

وہ سب دیکھتا ہوں جو ہیجان ہے

جس میں نقصان ہے' اور----!

اُدھر باپ ‘

پندونصیحت کی گٹھری لیے

میرے سر پر کھڑا ہے

اِدھر ماں ‘

زلیخا کا قصہ سنا کر

مجھے سورہ یوسف کا دم کر رہی ہے

جوانی ‘

کوئی دھند ہے

جس میں اُترے چلا جا رہا ہوں

کوئی دھوپ ‘

میرے بدن کو جلائے

تو کیا لطف آئے!

محبت ‘

مرا ہاتھ تھامے ہوئے ہے

مجھے زندگی گنگنانے لگی ہے

مرے خواب ‘

رنگین ہونے لگے ہیں!!

کتے

یہ کالے کتے!

اندھیری دوزخ کے کالے کتے!

ہم اہلِ جنت پہ بھونکتے ہیں

ہم اہلِ جنت

ہم اہلِ حرف و ہنر کہ جن سے
اِک ایک ذرے میں زندگی ہے
شعورِ عالم میں تازگی ہے
یہ کالے کتے

جو اپنی برفوں کی تیرہ صبحوں میں داغ بن کر چمک رہے ہیں
یہ اپنی برفوں میں دفن ہوں گے
ہم اہلِ دل جو

ہر ایک ظالم
ہر ایک جابر کی تیرہ سوچوں کے روبرو ایستادہ ہو کر

دیے جلاتے ہیں
رقص کرتے ہیں
روشنی کے پیامبر ہیں!
مگر یہ کتے!
یہ کالے کتے جو بھونکتے ہیں
جو آدمیت پہ بھونکتے ہیں
جو اہلِ مشرق کی سالمیت پہ بھونکتے ہیں------

یہ طے ہو چکا ہے

آج دیوار میں چن دیا جائے گا

عشق کو آج دیوار میں چن دیا جائے گا

عشق صحرا نشیں

قیس کے خانوادے کا فردِ حسین

آج دیوار میں چن دیا جائے گا

ہاتھ خالی ہیں

تاریخ کے ہاتھ خالی ہیں

کشکول میں کچھ نہیں

چند سکے ہیں

وہ بھی پرانے زمانے کا قصہ ہوئے ہیں

جو توقیر و تقدیس سب کھو چکے ہیں

بساطِ زمانہ پہ پھیلے ہوئے ہیں
کہیں پر ہمارے اب وجد کے آنسو
کہیں حزنِ عثمانیہ کے چراغوں کی لو ہے
کہیں لشکری اپنے نعروں کی استھائیاں پڑھ رہے ہیں

کہیں پر لہو رنگ گھوڑوں کی نعلوں سے

اٹھتی ہوئی سرخ چنگاریاں ہیں

کہیں علم و حکمت کی خوشبو

کہیں وجد کے آسماں پر ستاروں کا رقصِ رواں

عالم ہست ہے رقصِ رومی میں گم

عشق کارِ سخن

عشق موجِ ختن

ایک حجرے میں ڈھلتی ہوئی شام ہے

موجِ الہام ہے

عشق بدنام ہے

ہاں میں بدنام ہوں

سر بسر عشق ہوں

اور مجھے آج دیوار میں چن دیا جائے گا

عشق کو آج دیوار میں چن دیا جائے گا

یہ زمینی خداؤں میں طے ہو چکا ہے۔۔۔۔۔۔

اس پار۔۔۔۔

جہاں تصویر بنواتے ہوئے،
جو مسکراہٹ ہے
وہی چہرے پہ سچ مچ ہو!
جہاں پہ سرمئی شامیں
پہاڑوں سے الجھتی ہوں
جہاں پہ چاندنی شبنم کے سائے میں ٹہلتی ہو
جہاں امید کی سب کشتیاں دل کے سمندر میں اترتی ہوں
جہاں آنکھوں کے خوابوں کو
حسیں تعبیر ملتی ہو
جہاں خاموشیوں نے آسماں کے راز کھولے ہوں
جہاں کے موسموں پر دھوپ کا پہرا نہیں ہوتا
جہاں تکلیف کا احساس ہوتا ہے، مگر
گہرا نہیں ہوتا
جہاں پہ سوچ کے پنچھی اڑیں،
ان کو کوئی خطرہ نہ لاحق ہو
جہاں ادراک کی سرحد نہیں ہوتی
جہاں پر زندگی اور موت کا کچھ ڈر نہیں ہوتا
مجھے بھی لے چلو
اک بار
بس اُس پار۔۔۔۔۔۔!

ایک ادھوری نظم

آئے کبھی خوشبو بھی اگر تیرے نگر سے
دیکھیں جو کبھی حُسن ترا حسنِ نظر سے

واعظ کہاں تقریر کے پھر جوش میں رہتے
یہ رندِ بلا نوش کہاں ہوش میں رہتے
یہ رنگ بھلا کیا تری تصویر بناتے
شاعر تری تعریف میں کیا حرف سجاتے

تجھ سا کوئی ہوتا تو اُسے ڈھونڈ نہ لاتے !!

لوٹنا ہوگا

وہ کوئی نظم تھی
اِک نظم
میری نظم۔۔۔۔۔
میری داہنی پسلی سے نکلی
اور چہرے پر چلی آئی
مرے ہونٹوں پہ تھرکی
رقص کرتی
یقین و بے یقینی کے کسی سفاک لمحہ میں
مری بے چین آنکھوں میں اتر آئی۔۔۔۔
سنا تم نے
وہ کوئی نظم تھی
اِک نظم۔۔۔۔۔میری نظم
جس کے رنگ جذبوں میں رچے تھے اور۔۔۔۔
کسی کے ہونٹ

آنکھیں

لفظ

مصرعے

سب کے سب

کئی اجزا باہم آمیز ہو کر نظم کی صورت میں آئے تھے

ردائے خامشی اوڑھے زمانہ------

فصیل ضبط سے آگے --- کئی بوجھل دشائیں

چپ کھڑی ہیں

تمھیں اب لوٹنا ہوگا

ہوائیں اور پرندے

پھول، شبنم، شاعری

خوشبو، تمنا

خداوندا

میں پاگل ہو رہا ہوں کیا؟

کوئی سایہ-----

یہ شانوں پر دھری تنہائیاں

شب بھر کسے آواز دیتی ہیں

کوئی نظم اب بھی اپنے خالق

اپنے آخری مالک کا رستہ دیکھتی ہے

میں اب بھی سوچ میں گم ہوں

کہ آخر ہینڈ میڈ اِس نظم کو

کس نے بنایا ہے؟

یہ میری نظم ہے

جو دائیں پسلی سے نکل کر،

بائیں پسلی کے سہارے

میرے ہونٹوں پر تھرکنے لگ گئی ہے

مری تنہائیاں کچھ اور گہری ہوگئی ہیں

یہ میری نظم ۔۔۔۔

میرے سایے سے اُلجھی ہوئی ہے

ہینڈ میڈ نظم

ہماری ہینڈ میڈ اس نظم کا
چرچا بہت ہے
شہر کی گلیوں سے لے کر
آسمانوں تک
ہماری ہینڈ میڈ اس نظم کا چرچا بہت ہے

اس صدائے کن سے پہلے کون تھا؟
کیا تھا؟
جو یہ صورت پہن کر آ گیا ہے
زمیں سے آسماں تک صورتیں ہی صورتیں ہیں!
رقص کرتی،
بین کرتی،
خواب بنتی،
ہنستی روتی صورتیں ہی صورتیں ہیں!
اور ان کے درمیاں اک نظم

افسردہ کھڑی ہے

مرے ماحول سے نالاں، گریزاں نظم ۔۔۔۔۔

جس نے آخری صورت پہن لی ہے

۔۔۔۔تری صورت

یہ بالکل آخری صورت ۔۔۔۔۔۔۔

ترے سب نقش میری نظم میں آنے لگے ہیں!

شہر میں اور شہر سے باہر

مری اِس نظم ۔۔۔۔

میری ہینڈ میڈ اس نظم کا چرچا بہت ہے

سبھی آنکھیں

سبھی سپنے

مری اس نظم ۔۔۔۔۔

ہینڈ میڈ اس نظم

سے وابستہ ہوکر رہ گئے ہیں

میں

بہت آگے نکل آیا ہوں

ماہ وسال پیچھے رہ گئے ہیں

کوکھ

یہ بانجھ کب تھی!
برہنہ کرنے کو اس زمیں پر جو ہل چلایا
تو بیج سے حاملہ ہوئی ہے
میں اس پہ پھوٹے ہوئے شگوفوں کو اپنی تخلیق کہہ رہا ہوں
میں اپنے بیٹوں کی بے رخی
اور اپنی بیٹی کی رخصتی کے تمام دکھ بھی انھیں سناتا
جو میری نظموں میں آچکے ہیں
مِری ہزیمت کی داستانوں کو کون سنتا
مگر یہ کالی گھٹائیں ، بارش۔۔۔
ابارشن پر تلی ہوئی ہے

زینم کے لیے ایک نظم

کہانی یوں سناتے تھے
سنا ہے اگلے وقتوں میں۔۔۔۔
کوئی جن تھا
اور اس کی جان طوطے میں مقید تھی
تھا کوئی دیو۔۔۔۔
جس کی جاں فلاں میں تھی ۔۔۔
۔۔۔ فلاں میں تھی
کہانی۔۔۔
ہاں کہانی میں کوئی کردار بدلا ہے
مجھے بھی ایسا لگتا ہے
کہ میری جان اِک ننھی سی ہنستی کھیلتی گڑیا میں ہے
جو سانس لیتی ہے
تو میری نبض چلتی ہے
وہ ہنستی ہے
تو لگتا ہے
زمانہ کھلکھلاتا ہے
وہ مجھ سے کھیل میں جب جیت جاتی ہے
تو اس پر جشن کرتی، ناچتی ہے، مسکراتی ہے
میں اپنے سارے غم اُس ایک پل میں بھول جاتا ہوں
میں دل سے مسکراتا ہوں

میں ایسے ہارنے کو جیت پر ترجیح دیتا ہوں
مجھے ان دل نشیں آنکھوں میں آنسو زہر لگتے ہیں
میں جب بھی گھر پلٹتا ہوں
تو دروازے کی آہٹ پر
ہمیشہ بھاگ کر آتی ہے اور مجھ سے لپٹتی ہے
کبھی کندھوں پہ چڑھتی ہے
میں آنکھیں موند لیتا ہوں
تو وہ مجھ کو منانے کے لیے آوازیں دیتی ہے
مِرا منہ چوم لیتی ہے
اگر آنکھیں نہیں کھولوں تو وہ ناراض ہو کر
دونوں ہاتھوں سے مِری آنکھیں کھجاتی ہے
میں جھٹ سے بول اُٹھتا ہوں
میں اُس کو گدگداتا ہوں
تو اِک دم سے اچھلتی کودتی ہے
دودھ میں گوندھی ہوئی خوشبو پہ میٹھے شہد کے مانند دِکھتی ہے
کبھی آواز بھاری کر کے وہ مجھ کو ڈراتی ہے
میں سچ میں ڈر بھی جاتا ہوں
عجب کچھ واہمے بھی ہیں۔۔۔۔
نہ جانے کل کلاں کیا ہو؟
کسی دن جب میں واپس گھر نہ آؤں تو۔۔۔
اگر آواز دے گی۔۔۔ اور۔۔۔ اُس دن میں نہ بولوں تو!
کہ وہ ناراض ہو گی اور۔۔۔ میں آنکھیں نہ کھولوں تو!

میں جاؤں کہاں؟

پرانے پجاری کے ہاتھوں بڑے دیوتا کی
تجوری سے چوری ہوا مال دیکھا تو گرجے میں رکھی ہوئی نیکیاں
چھوڑ کر، راسموسس کی وہسکی میں ڈوبی ہوئی لڑکیاں دیکھ کر میں
نے جلدی سے بوڑھی کتابیں سنبھالیں، پرانے لفافوں سے
غزلیں نکالیں کہ رخصتِ سفر میں سلیقہ دکھانے کی فرصت کہاں تھی سو
نظموں کے بوسیدہ کاغذ اٹھا کر، سدھارتھ سے آنکھیں بچا کر میں
بھاگا ہی تھا کہ بوقت سحر اِک اذاں کے طلسمِ رواں نے جوروکا تو
مسجد پہنچ کر میں سمجھا کہ میرا سفر کٹ گیا ہے، مگر سستے داموں
یہاں ایک مُلا خدا بیچتا ہے۔
۔۔۔۔میں جاؤں کہاں!

یثرب والا!

کوئی فسانہ۔۔۔۔
نہ نظم ہے یہ۔۔۔۔
یہ شہرِ یثرب کی ایک نکڑ پہ چند لوگوں کی گفتگو ہے
مِرے پڑوسی۔۔۔
او میرے بھائی!
میں کیا بتاؤں
یہ غیر معمولی واقعہ ہے
سنا ہے وہ میرے شہرِ یثرب کو اِک نیا نام دے رہے ہیں

اِک اور بولا۔۔۔
قریش سے ہے
مِرے قبیلے کی دشمنی ہے
ہنگورا دے کر اِک اور بولا۔۔
یہ بات سچ ہے جو اُس کو دیکھے اُسی کا ہولے
وہ جس کا چاہے اُسی کے سینے میں دل اُلٹ دے
یقین جانو
کہ میری آنکھوں میں اتنے آنسو کبھی نہیں تھے
میں سوچتا ہوں کہ دودھ کی یہ دکان اُٹھا دوں
خدا کے بندے کے پیچھے چل دوں

اسی کے کہنے پہ زندگی کی رُتیں بِتا دوں
کوئی پیمبر ہی لگ رہا ہے
وہ سچی باتیں
وہ پیاری باتیں
دِلوں پہ اُتریں
جو اُس کی باتوں پہ کان دھر لے
تو یہ کہے گا کہ سارا سچ ہے
جو کہہ رہا ہے
وہ بات حق ہے
وہ کہہ رہا ہے کہ جھوٹ چھوڑو
بتوں کو توڑو
وہ اب غلاموں کو، لونڈیوں کو
برابری کے حقوق دے گا
شراب پینا بھی بند کر دو
جو سود لے تو خدا کی لعنت

عجیب ہے وہ
مجھے بتاؤ میں کیا کروں گا!

وہ کہہ رہا ہے
کہ اپنی دولت غریب لوگوں میں بانٹ دو تم
پڑوسیوں کے حقوق دو تم
جو لوگ تم کو ستا رہے ہیں معاف کر دو

کہ تم کسی کا بھی حق نہ مارو
وہ بے سہاروں کا ہے سہارا
امین ہے وہ
یہ شہر سارا گواہی دیتا ہے
اُس کے جیسا کوئی نہیں ہے
عجیب سوز و گداز ہے اس کی گفتگو میں
میں اُس کی باتوں کو سن کے اکثر یہ سوچتا ہوں
کہ کام دھندے کو چھوڑ کر اُس کے ساتھ ہولوں
تو جانے بھی دے
یہ بات ہے کیا؟
مرے بزرگوں کے دین کو بھی وہ جھوٹ کہتا ہے
اور کہتا ہے ہاتھ سے جو بنا رہے ہو وہ توڑ دو تم
سبھی خداؤں کو چھوڑ دو تم
بس ایک ہے جس کو مانتا ہے
وہ جس کو دیکھا نہیں ہے ہم نے
میں اُس کی باتوں پہ ہنس رہا ہوں
سنا ہے حسنِ سلوک ہر اِک سے کر رہا ہے
اِسے تو چھوڑو
وہ سب خداؤں کو جھوٹا کہنے پہ تل گیا ہے
قسم ہے مجھ کو
میں اُس کی باتیں نہیں سنوں گا

میں اُس سے چھپ کر نہیں ملوں گا
نہیں نہیں۔۔۔
میں نہیں سنوں گا
میں اُس کی باتوں سے دور بھاگا
کہ لوگ کیا کیا نہیں کہیں گے
ہماری غیرت یہ بات کیسے گوارا کر لے
کہ وہ بتوں کو برا کہے گا تو کاٹ دیں گے
ہمارے ہاتھوں اُسے تو اب قتل ہونا ہوگا
ہماری توبہ؟
اسے تو لات ومنات کا بھی غضب نہیں ہے
میں ڈر رہا ہوں
ذرا سنو تو!
نہیں بچے گا!
کئی قبیلوں سے دشمنی ہے
بہت سے ہیں جو خفا ہیں اُس سے
طبیب سارے جو سب مریضوں کو لوٹتے تھے
وہ کیا کریں گے؟
یہی فریبی طبیب سارے
جو خون تک کو نچوڑ لیتے
پتا چلا ہے لعاب رکھ کر دعا کرے تو
شفاء ملی ہے

یہ بات اُس کی بھلی لگی ہے

(جوان بولا)

مجھے تو لگتا ہے جادوگر ہے
وہ بوڑھی اماں کی بھاری گٹھری
اٹھا کے چپ چاپ چل پڑا تھا
جو کہہ رہی تھی
کہ شہر میں ایک جادوگر ہے
تم اُس سے بچنا!
مگر وہی تھا
وہ اُس کی ہولی
غضب تو یہ ہے کہ روز کوڑا جو پھینکتی تھی
اب اُس کی تعلیم دے رہی ہے
جو قتل کرنے چلا گیا تھا
اب اُس کا ساتھی بنا ہوا ہے
جو شہر والے یہ کہہ رہے تھے اِسے نکالو
اُسی کو صادق، امین کہنے پہ تل گئے ہیں
سنا ہے میں نے
کہ سارے آسیب اُس کے قدموں میں آگرے ہیں
تم اُس کو کاہن سمجھ رہے ہو؟
میں کاہنوں کی ہر اِک کہانت کو جانتا ہوں

سفید بالوں سے کہہ رہا ہوں
نہیں ہے کاہن
مگر وہ شاعر ضرور ہوگا
اِک اور بولا؟
اے بھائی بندو
خدا قسم کہ میں خود ہوں شاعر
سو کہہ رہا ہوں نہیں وہ شاعر
بہت سے دیکھے ہیں ہم نے شاعر
نہ اختناقی
نہ وہ دوانہ
نہ اُس کی باتیں ہیں بے سروپا
مگر۔۔۔۔
مجھے ایک رنج بھی ہے!
بھلا بتاؤ یہ کیا پڑی تھی
یہ واقعہ بھی سنا تو ہوگا
عجیب حرکت ہے۔۔
اِک پیالے میں دودھ تھا اور
ساٹھ، ستر نے پیٹ بھر کے وہ پی لیا ہے
مجھے بتاؤ۔۔
کہ دودھ جو لوگ بیچتے ہیں وہ کیا کریں گے؟

میں خود بھی مدت سے ایسے پیشے سے منسلک ہوں
بہت ہی مشکل سے ہے گزارا
ہمارا دھندہ ہوا ہے چوپٹ
یہ بات ناحق لگی ہے مجھ کو
اور اب کے آخر میں ایک باریش بوڑھا بولا
اے میرے بھائی!
میں صلح کل آدمی ہوں اور اتنا کہہ رہا ہوں
کئی صحیفوں میں ذکر اس کا میں پڑھ چکا ہوں
وہی نہیں ہے۔۔۔
کہ جس کے شانوں پہ مہر ہوگی
یہ بات سچ ہے تو وہ یقیناً
خدا کا سچا رسول ہوگا!
کتاب جو بھی وہ پڑھ رہا ہے
مجھے سناؤ!
وہ چاند چہرہ مجھے دکھاؤ!
اسی کا کلمہ مجھے پڑھاؤ!